

مضمون

اردو میں مختصر مضمون کی روایت کو انیسویں صدی کے دوران بہت ترقی ملی۔ مضمون نگاری نثر کی باضابطہ صنف نہیں ہے۔ بہت سے لکھنے والوں نے کسی خیال، تجربے، واردات کو مرتب انداز میں اس طرح پیش کیا کہ اس سے خود بہ خود ایک شکل بن گئی اور مضمون کہلائی۔ سرسید اور ان کے معاصرین نے مضمون نگاری کو سماجی اصلاح کے ایک وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔ سماجی موضوعات کے علاوہ علمی، ادبی، فلسفیانہ اور تہذیبی و معاشرتی موضوعات پر بھی مضامین لکھے گئے۔ حالی، شبلی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، میر ناصر علی، نیاز فتح پوری، رشید احمد صدیقی، مہدی افادی، سجاد انصاری، خواجہ حسن نظامی، مرزا فرحت اللہ بیگ، محفوظ علی بدایونی، ابوالکلام آزاد اور خواجہ غلام السیدین وغیرہ اردو کے اہم مضمون نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

مختصر مضمون کی ہی ایک شکل انشائیہ بھی ہے۔ انشائیہ میں عام طور پر مزاح اور طنز یا خوش مزاجی کا رنگ ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار اکثر اپنے حوالے سے، یا اکثر اپنے ہی بارے میں باتیں کرتا ہے۔ اچھے انشائیوں میں تخلیقیت کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔

شبلی نعمانی

(1857 — 1914)

شبلی اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی اور مولانا فاروق چریاکوٹی اور اس زمانے کے دوسرے ممتاز اہل علم سے فیض حاصل کیا۔ 1884 میں شبلی علی گڑھ آگئے۔ یہاں انھیں تدریس کے ساتھ ساتھ پڑھنے لکھنے کا خوب موقع ملا۔ سرسید کے ساتھ رہنے اور کام کرنے کے باعث شبلی کے ذہن اور علم نے بہت ترقی کی اور وہ مسلمانوں کی قومی زندگی کے اہم مسائل سے روشناس ہوئے۔ انھوں نے روم و شام اور مصر کا سفر کیا۔ کچھ روز حیدرآباد کے دارالترجمہ میں بھی کام کیا۔ پھر لکھنؤ میں ندوۃ العلماء سے وابستہ رہے۔ آخری عمر میں اپنے آبائی وطن اعظم گڑھ چلے گئے۔ یہاں انھوں نے دارالمصنفین قائم کیا جو شبلی اکیڈمی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

شبلی نے اردو نثر و نظم کے مختلف شعبوں میں بہت وسیع خدمات انجام دی ہیں۔ تاریخ، فلسفہ، مذہبیات اور مختلف دینی و دنیوی علوم پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ اردو اور فارسی کے بہت اچھے شاعر بھی تھے۔

فارسی زبان و ادب کی مشہور تاریخ ”شعر الجم“ ان کا کارنامہ ہے۔ اردو سوانح اور سیرت نگاری میں بھی شبلی نے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اس میدان میں ان کی کتابیں سیرۃ البنی (جلد اول) سوانح مولانا روم، الغزالی، الفاروق اور النعمان بہت مشہور ہیں۔ سوانح اور تاریخ کے علاوہ تنقید کے میدان میں شبلی نے بعض نئے کام کیے۔ مثلاً ”موازنہ انیس و دیر“ اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں اردو شاعروں کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ شبلی کے تنقیدی شعور کی

ترجمان ہے۔

شبلی کا اسلوب عالمانہ ہوتے ہوئے بھی بہت دل کش اور موثر ہے۔ ان کی نثر میں شگفتگی اور صلابت کے عناصر نمایاں ہیں۔

© NCERT
not to be republished

سر سید مرحوم اور اردو لٹریچر

سر سید کے جس قدر کارنامے ہیں، اگرچہ رفرامیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے، لیکن جو چیزیں خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرے سے آفتاب بن گئیں، اُن میں سے ایک اردو لٹریچر بھی ہے۔ سر سید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرے سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر، وسعت و جامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہے کہ خود اُس کی اُستاد یعنی فارسی زبان کو، آج تک یہ بات نصیب نہیں۔ مُلک میں آج بڑے بڑے انشا پرداز موجود ہیں جو اپنے اپنے مخصوص دائرہ مضمون کے حکمران ہیں، لیکن اُن میں سے ایک شخص بھی نہیں جو سر سید کے بارِ احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو۔ بعض بالکل ان کے دامن تربیت میں پلے ہیں، بعضوں نے دور سے فیض اٹھایا، بعض نے مدعیانہ اپنا الگ راستہ نکالا ہے۔ تاہم سر سید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیوں کر رہ سکتے تھے؟

سر سید کی جس زمانے میں نشوونما ہوئی، دلی میں اہل کمال کا مجمع تھا، اُمرا اور رؤسا سے لے کر ادنیٰ طبقے تک علمی ذوق پھیلا ہوا تھا۔ سر سید جس سوسائٹی کے ممبر تھے، اس کے بڑے بڑے ارکان مفتی صدر الدین خاں آزرہ، مرزا غالب اور مولانا صہبائی تھے۔ ان میں سے ہر شخص تصنیف و تالیف کا مالک تھا، اور انھیں بزرگوں کی صحبت کا اثر تھا کہ سر سید نے ابتدا ہی میں جو مشغلہ علمی اختیار کیا، وہ تصنیف و تالیف کا مشغلہ تھا۔

اول وہ رواج عام کے اقتضا سے شاعری کے میدان میں آئے۔ ابھی تخلص اختیار کیا اور اردو میں ایک چھوٹی سی مثنوی لکھی، جس کا ایک مصرع انھیں کی زبانی سنا ہوا مجھے یاد ہے۔

نام میرا تھا، کام ان کا تھا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کو شاعری سے مناسبت نہ تھی، اس لیے وہ بہت جلد اس کوچے سے نکل آئے اور نثر کی طرف توجہ کی۔ چوں کہ حقائق اور واقعات کی طرف ابتدا سے میلان تھا، اس لیے دلی کی عمارتوں اور یادگاروں کی تحقیقات شروع کی اور نہایت محنت و کوشش سے اس کام کو انجام دے کر 1847ء میں ایک مبسوط کتاب لکھی جو آثار الصنادید کے نام سے مشہور ہے۔

اس وقت اگرچہ سرسید کے سامنے اردو نثر کے بعض عمدہ نمونے موجود تھے خصوصاً میرامن کی، ”چہار درویش“ جو 1802ء میں تالیف ہوئی تھی، اور جس کی سادگی، صفائی اور واقعہ طرازی آج بھی موجودہ تصنیفات کی برابری کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ اس کے ساتھ مضمون جو اختیار کیا گیا تھا، یعنی عمارت اور آثار کی تاریخ، وہ تکلف اور آورد سے ابا کرتا تھا، تاہم ”آثار الصنادید“ میں اکثر بیدل اور ظہوری کا رنگ نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سرسید کی رات دن کی صحبت مولانا امام بخش صہبائی سے رہتی تھی اور مولانا نے موصوف بیدل کے ایسے دل دادہ تھے کہ ان کا کلمہ پڑھتے تھے اور جو کچھ لکھتے، اُسی طرز میں لکھتے تھے۔ سرسید نے مجھ سے خود بیان کیا کہ آثار الصنادید کے بعض بعض مقامات بالکل امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں، جو انھوں نے میری طرف سے اور میرے نام سے لکھ دیے تھے۔

”آثار الصنادید“ جس زمانے میں نکلی اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد تقریباً 1850ء میں، دلی کے مشہور شاعر مرزا غالب نے اردو کی طرف توجہ کی یعنی مکاتبات وغیرہ اردو میں لکھنے شروع کیے اور چونکہ وہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے اپنا کوچہ الگ نکال کر رہتے تھے، اس لیے انھوں نے تمام ہم عصروں کے برخلاف مکاتبہ کو مکالمہ کر دیا۔ مکاتبات میں وہ بالکل اسی طرح ادائے مطلب کرتے تھے جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔ اس کے ساتھ بہت سے خطوط میں انسانی جذبات مثلاً رنج و غم، مسرت و خوشی، حسرت و بیکسی کو نہایت

خوبی سے ادا کیا ہے۔ اکثر واقعات کو اس بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہیں کہ اردو انشا پردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجتہد اور امام سر سید مرحوم تھے، اس کا سنگ بنیاد دراصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔ سر سید کو مرزا غالب سے جو تعلق تھا وہ ظاہر ہے۔ اس لیے کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ سر سید ضرور مرزا کی طرز سے مستفید ہوئے۔

اسی زمانے میں ہندوستان کے ہر حصے میں کثرت سے اردو اخبارات جاری ہو گئے اور اردو انشا پردازی کو روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ اخبارات کو ہر قسم کے اخلاقی، تمدنی، ملکی، مذہبی، تاریخی مسائل سے کام پڑتا تھا۔ اسی لیے ہر قسم کے مضامین لکھے گئے۔ تاہم انشا پردازی کا کوئی خاص اسٹائل متعین نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ جو کچھ تھا ابتدائی حالت میں تھا۔

1287ھ میں جس کو آج کم و بیش 27 برس ہوئے سر سید نے قوم کی حالت کی اصلاح کے لیے ”تہذیب الاخلاق“ کا پرچہ نکالا، اور اردو انشا پردازی کو اُس رتبے پر پہنچا دیا جس کے آگے اب ایک قدم بھی بڑھنا ممکن نہیں۔ سر سید نے اردو میں جو باتیں پیدا کیں اُس کو وہ مختصراً ”تہذیب الاخلاق“ میں خود ایک مقام پر لکھتے ہیں۔ اُن کی عبارت یہ ہے:

”جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ رنگین عبارت سے، جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو، مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے، تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔“

اس آرٹیکل میں سر سید نے انشا پردازی کے اور بہت سے اصول بتائے ہیں جن کو اس موقع پر اختصار کی وجہ سے قلم انداز کرتے ہیں۔

سر سید کی انشا پردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ

کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا ہے اور جس مضمون کو لکھا ہے اس درجے پر پہنچا دیا ہے کہ اس سے بڑھ کر ناممکن ہے۔ فارسی اور اردو میں بڑے بڑے شعرا اور نثر نگاروں نے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو تمام قسم کے مضامین کا حق ادا کر سکتا۔ فردوسی بزم میں رہ جاتا ہے، سعدی رزم کے مردمیدان نہیں، نظامی رزم و بزم دونوں کے استاد ہیں لیکن اخلاق کے کوچے سے آشنا نہیں، ظہورؒ صرف مدحیہ نثر لکھ سکتا ہے، برخلاف اس کے سرسیدؒ نے اخلاق، معاشرت، پالیٹکس، مناظر قدرت وغیرہ سب پر لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے لا جواب لکھا ہے۔ مثال کے طور پر بعض بعض مضامین کے جتنے جتنے فقرے نقل کرتے ہیں:

”دیکھ نادان! بے بس بچہ گہوارے میں سوتا ہے۔ اُس کی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے۔ اور اُس کے گہوارے کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے۔ ہاتھ کام میں اور دل بچے میں ہے اور زبان سے اُس کو یوں لوری دیتی ہے: سورہ! میرے بچے! سورہ! اے اپنے باپ کی مورت! اور میرے دل کی ٹھنڈک، سورہ! اے میرے دل کی کونیل، سورہ! تجھ پر کبھی خزاں نہ آئے، تیری ٹہنی میں کبھی کوئی خار نہ پھوٹے۔ کوئی کٹھن گھڑی تجھ کو نہ آئے سورہ، میرے بچے سورہ! میری آنکھوں کے نور، اور میرے دل کے سرور میرے بچے سورہ! تیرا منگھڑا اچاند سے بھی زیادہ روشن ہوگا تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی۔ تیری شہرت، تیری لیاقت، تیری محبت جو تو ہم سے کرے گا ہمارے دل کو تسلی دے گی۔ سورہ، میرے بچے سورہ! سورہ، میرے بالے سورہ!“

”یہ اُمید کی خوشیاں ماں کو اُس وقت تھیں، جب کہ بچہ غوں غاں بھی نہیں کر سکتا تھا مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے ماں کے دل کو شاد کرنے لگا اور اناں اناں کہنا سیکھا، اس کی پیاری آواز، ادھورے لفظوں میں اُس کی ماں کے کان میں پہنچنے لگی، آنسوؤں سے اپنی ماں کی آتش محبت کو بھڑکانے کے قابل ہوا۔ پھر مکتب سے اُس کو سروکار پڑا۔ رات کو ماں کے سامنے، دن کا پڑھا ہوا سبق غم زدہ دل سے سنانے لگا اور جب کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ

کر، منہ ہاتھ دھو کر، اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز میں کھڑا ہونے لگا اور اپنے بے گناہ دل، بے گناہ زبان سے، بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا، تو امید کی خوشیاں اور کس قدر زیادہ ہو گئیں۔ آہ! ہماری پیاری امید تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے ساتھ ہے۔“

”وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان میں کھڑا ہے۔ کوچ پر کوچ کرتے تھک گیا ہے۔ لڑائی کے میدان میں جب کہ بہادروں کی صفیں کی صفیں چُپ چاپ کھڑی ہوتی ہیں، اور لڑائی کا میدان ایک سنسان عالم ہوتا ہے، دلوں میں ایک عجیب قسم کی خوف ملی ہوئی جرات ہوتی ہے اور جب کہ لڑائی کا وقت آتا ہے اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہے اور جب کہ بجلی سی چمکنے والی تلواریں اور سنگینیں اُس کی نظر کے سامنے ہوتی ہیں اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشیں پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپوں کی آواز سنتا ہے اور جب کہ اپنے ساتھی کو خون میں لٹھڑا ہوا، زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہے تو اسے بہادروں کی قوت بازو اور اے بہادروں کی ماں! تیرے ہی سبب سے فتح مندی کا خیال، اُس کے دل کو تقویت دیتا ہے۔ اُس کا کان نقارے میں سے تیرے ہی نغمہ کی آواز سنتا ہے۔“

تم دیکھ سکتے ہو کہ ان چند سطروں میں کس طرح نیچر کی تصویر کھینچی ہے اور اس میں کس قدر درد و اثر پیدا کیا ہے۔

پالیٹکس کا راستہ اس سے بالکل الگ ہے۔ پنجاب میں جب یونیورسٹی قائم ہو رہی تھی، جس میں اورینٹل تعلیم پر بہت زور دیا گیا تھا سر سید کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سے پالیٹکس کی بنا پر ہم کو اعلیٰ تعلیم سے روکنا مقصود ہے۔ اُس وقت سر سید نے پے در پے تین آرٹیکل لکھے۔ اُن تین آرٹیکلوں نے یونیورسٹی کے بانیوں کو اس قدر گھبرا دیا، کہ خاص ان آرٹیکلوں کے جواب میں سیکڑوں مضامین لکھے گئے۔ اور اُن کا مجموعہ یک جا کر کے ایک مستقل کتاب تیار کی۔ افسوس ہے کہ اختصار کی وجہ سے ہم اُن آرٹیکلوں کا کوئی حصہ نقل نہیں کر سکتے۔

سر سید نے انشا پر دازی کی ترقی کے جو طریقے ایجاد کیے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ

بہت سے اعلیٰ درجے کے انگریزی مضامین کو اردو زبان کا قالب پہنایا لیکن ترجمے کے ذریعے سے نہیں، کیوں کہ یہ طریقہ اب تک بے سود ثابت ہوا ہے، بلکہ اس طرح کہ انگریزی کے خیالات اردو میں، اردو کی خصوصیات کے ساتھ ادا کیے۔ امید کی خوشی کا مضمون جس کے ہم نے بعض فقرات اوپر نقل کیے، دراصل ایک انگریزی مضمون سے ماخوذ ہے۔ انگریزی میں اڈیسن اور اسٹیل بڑے مضمون نگار گزر رہے ہیں، سرسید نے ان کے متعدد مضامین کو اپنی زبان میں ادا کیا ہے۔ سرسید کی انشا پردازی کا بڑا کمال اس موقع پر معلوم ہوتا ہے جب وہ کسی علمی مسئلے پر بحث کرتے ہیں۔ اردو زبان چونکہ کبھی علمی زبان کی حیثیت سے کام میں نہیں لائی گئی، اس میں علمی اصطلاحات، علمی الفاظ اور علمی تلمیحات بہت کم ہیں، اس لیے اگر کسی علمی مسئلے کو اردو میں لکھنا چاہو تو الفاظ مساعدت نہیں کرتے۔ لیکن سرسید نے مشکل سے مشکل مسائل کو اس وضاحت، صفائی اور دل آویزی سے ادا کیا ہے کہ پڑھنے والا جانتا ہے کہ وہ کوئی دلچسپ قصہ پڑھ رہا ہے۔

تہذیب الاخلاق جب بند ہوا تو سرسید نے خاتمہ پر جو مضمون لکھا ہے اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:

”سو توں کو جھنجھوڑتے ہیں کہ جاگ اٹھیں۔ اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو مطلب پورا ہو گیا اور اگر نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے، کچھ جھنجھلائے ادھر ہاتھ جھٹک دیا، ادھر پیر جھٹک دیا اور اینڈے پڑے سوتے رہے، تو بھی توقع ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے۔ شاید ہمارے بھائیوں کی اس آخر درجے تک نوبت آگئی ہے۔ اگر یہ خیال ٹھیک ہو تو ہم کو بھی زیادہ نہ چھیڑنا چاہیے۔ بچے اٹھاتے وقت کہہ اٹھتے ہیں کہ ہم کو اٹھائے جاؤ گے تو ہم اور پڑے رہیں گے، تم ٹھہر جاؤ، ہم آپ ہی اٹھ کھڑے ہوں گے۔ بچہ کڑوی دوا پیتے وقت منہ بسور کر ماں سے کہتا ہے کہ بی! یہ مت کہے جاؤ کہ شاباش بیٹا! پی لے، پی لے، تم چپ رہو، میں آپ ہی پی لوں گا۔ لو بھائیو! اب ہم بھی نہیں کہتے کہ اٹھو پی لو، پی لو۔“

حقیقت یہ ہے کہ سر سید نے اردو انشا پر دازی پر جواثر ڈالا ہے، اس کی تفصیل کے لیے دو چار صفحے کافی نہیں ہو سکتے۔ یہ کام درحقیقت مولانا حالی کا ہے۔ وہ لکھیں گے اور خوب لکھیں گے، بلکہ یہ کہنا چاہیے لکھ چکے ہیں اور خوب لکھا ہوگا۔ میں کالج کی طرف سے مجبور کیا گیا تھا کہ اس وقت جب کہ تمام ملک میں سر سید کا آوازہ ماتم گونج رہا ہے اور ہر شخص ان کے کارناموں کے سننے کا شائق ہے، کچھ نہ کچھ مختصر طور پر لکھنا چاہیے۔ میں نے اس کی تعمیل کی۔ ورنہ میں مولانا حالی کی مقبوضہ سرزمین میں مداخلت کا کوئی حق نہیں رکھتا۔

مشق

لفظ و معنی

رِفارمیشن

اصلاح : (Reformation)

لٹریچر

ادب : (Literature)

پھیلاؤ، تفصیل : وسعت

مکمل، ہمہ جہتی : جامعیت

نشانیوں، باقیات : آثار

دعوئی کرتے ہوئے : مدعیانہ

فیض قبول کرنا : فیض پذیری

تقاضا : اقتضا

مبسوط	:	تفصیلی، ضخیم
آورد	:	لانا، یہ لفظ آمد کے متضاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لکھتے ہوئے کسی چیز کو بناوٹ کے طور پر لانا آورد کہلاتا ہے۔
ابا کرنا	:	بچنا، چھوڑ دینا
دل دادہ	:	شوقین
مکاتبات	:	خطوط، مکاتیب کی جمع
بے کسی	:	مجبوری
مُجَدِّد	:	نئے راستے دکھانے والا
تمدنی	:	تہذیبی، سماجی
مُسْتَفِید	:	فائدہ اٹھانا
آرٹیکل	:	
(Article)	:	مضمون
قلم انداز کرنا	:	چھوڑ دینا
اسٹائل (Style)	:	انداز، طریقہ، طرز
نثار	:	نشر لکھنے والا
بزم	:	محفل
رزم	:	جنگ، لڑائی
جستہ جستہ	:	تھوڑا تھوڑا، کچھ کچھ
قالب	:	جسم، بدن
مُساعدت	:	ساتھ دینا، مدد کرنا
خصلت	:	مزاج، عادت

تقویت	:	قوت، مضبوطی
پالیٹکس	:	سیاست
(Politics)	:	اورینٹل
(Oriental)	:	دیسی
دل آویزی	:	دل لبھانا، دل پسندی
مقبوضہ	:	قبضہ کی ہوئی

غور کرنے کی بات

- ”ڈرے سے آفتاب بن جانے“ کا مطلب ہے کسی معمولی چیز کو بہت ترقی حاصل ہونا۔
- ”مخصوص دائرہ مضمون کے حکمران“ ہونے کا مطلب ہے: لکھنے کے مخصوص میدان کے ماہر۔
- اس کتاب کا نام ”باغ و بہار“ ہے جو فارسی کے مشہور قصے ”قصہ چہار درویش“ کا اردو ترجمہ ہے۔ اس لیے اس نام سے بھی مشہور ہے۔
- شبلی اس مضمون میں جس بات کی طرف خاص طور سے ہماری توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک فرد جب پختہ ارادے اور خلوص نیت سے کچھ کرنا چاہے تو پھر اس کی راہ میں کوئی مشکل حائل نہیں ہو سکتی۔ سر سید نے جب اردو زبان و ادب کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اسے سادگی کے ساتھ ساتھ وسعت و جامعیت عطا کرنے کا کام شروع کیا تو دھیرے دھیرے اردو کے شیدائیوں کا ایک ایسا گروہ اُن کے گرد جمع ہو گیا جس نے اردو ادب کے نئے علوم و اسالیب اور اصناف کا وہ

- خزانہ عطا کیا جس کی مثال اُس سے پہلے نہیں ملتی۔
- اس مضمون میں کئی فارسی شاعروں کے نام آئے ہیں جیسے بیدل، ظہوری، فردوسی، سعدی اور نظامی وغیرہ۔
- مضمون کے آخر میں شبلی نے لکھا ہے کہ مولانا حالی سرسید کے بہت قریبی ساتھی تھے اس لیے اُن پر مضمون لکھنے کا حق انھیں کا ہے۔ شبلی نے اس موضوع کو حالی کی مقبوضہ سرزمین کہہ کر، شوخ انداز اختیار کیا ہے۔
- سرسید مرحوم نے کسی غیر ملکی زبان کے کسی ادبی تجربے کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے انگریزی کا براہِ راست ترجمہ کرنے کے بجائے اُن خیالات کو اپنی زبان کے مطابق منتقل کیا ہے۔

سوالات

1. شبلی نے سرسید کی 1847 میں لکھی جس کتاب کا ذکر کیا ہے اُس کا نام اور موضوع لکھیے۔
2. سرسید کی انشا پردازی کا کیا کمال بتایا گیا ہے؟
3. انگریزی مضامین کو اردو میں لکھنے کے لیے سرسید نے کیا طریقہ اختیار کیا؟
4. حالی کی مقبوضہ سرزمین سے کیا مراد ہے؟

عملی کام

- انگریزی اخبار کی کسی رپورٹ کا ایسا ہی ترجمہ کیجیے جیسا اس سبق میں تجویز کیا گیا ہے۔

کہاوت

کسی بھی زبان کے ادب میں ضرب الامثال یا کہاوتوں کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ ان کہاوتوں کا تعلق ہماری زندگی کے روزمرہ واقعات سے ہوتا ہے۔ یہ کہاوتیں یا ضرب الامثال علم و دانش کے خزانے ہیں۔ کہاوتیں کہاں سے آتی ہیں، انہیں کون تصنیف کرتا ہے، یہ بتانا مشکل ہے۔ کوئی فرد یا ادارہ کہاوتیں تصنیف نہیں کرتا۔ یہ کسی ایک سماجی یا تہذیبی واقعے کے زیر اثر خود بہ خود وجود میں آ جاتی ہیں اور پھر ایک نسل سے دوسری نسل اور بعض اوقات ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچ جاتی ہیں۔

کہاوتوں کا تعلق عوام سے ہے۔ اس لیے ضروری نہیں کہ ان کا استعمال کرنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں۔ ان پڑھ، شہری، دیہاتی، گھروں میں رہنے والی عورتیں، ملازمت پیشہ لوگ سبھی برجستہ طور پر کہاوتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ کہاوتوں کے بارے میں ایک مصنف نے لکھا ہے کہ:

”کہاوت ایسے اقوال اور جملوں کو کہنا چاہیے جو کسی کتاب یا رسالے سے نہ لیے گئے ہوں۔ چوں کہ کہاوتوں کی تخلیق اور ان کی نشوونما عام آدمی کے ذریعے ہوتی ہے، اس لیے عام آدمی انہیں برجستہ طور پر استعمال کرتے ہیں۔“

شان الحق حقّی

(1917 — 2005)

شان الحق حقّی کا تعلق دہلی کے ایک قدیم اور ممتاز گھرانے سے تھا۔ اس خاندان نے ملک میں علم و فضل کی روشنی پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ حقّی کے جدِ اعلیٰ شیخ عبدالحق محدّث دہلوی فارسی اور عربی کی تقریباً سولہ کتابوں کے مصنف تھے۔ اُن کے بیٹے مولانا نور الحق بھی اعلیٰ پایے کے مصنف تھے۔ مرزا غالب کے ایک ممتاز شاگرد سیف الحق ادیب کا بھی اسی خاندان سے تعلق تھا۔ شان الحق حقّی کے والد بھی بڑے عالم تھے۔ قدیم اور جدید علوم پر اُن کی گہری نظر تھی۔ وہ شاعری کا بھی بہت اچھا مذاق رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ’دیوانِ حافظ‘ کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ اُن کی دو کتابوں ’’افسانہ پدمنی‘‘ اور ’’مطالعہ حافظ‘‘ کو اپنے زمانے میں بہت شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

فارسی اور اردو پر اُن کی گہری نظر تھی۔ اُنھیں ادب کے ساتھ ساتھ زبان سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ وہ ادب اور زبان دونوں کا بہت سہرا مذاق رکھتے تھے۔

حقّی صاحب کی ابتدائی تعلیم دہلی میں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی۔ اُنھوں نے مختلف اصنافِ ادب میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ شاعری، افسانہ، ڈراما، تنقید، تحقیق، ترجمہ نگاری اور لغت سازی اُن کی دلچسپی کے خاص میدان ہیں۔ اُنھوں نے بچوں کے لیے بھی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ سنسکرت اور انگریزی سے ان کے بعض ترجموں کو بہت شہرت ملی۔ تھیسارس (متراصف الفاظ کی لغت) اور لغات کی ترتیب و تدوین کے میدان میں حقّی

صاحب کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ”نکتہ راز“ اردو شعر و ادب کے کئی نامعلوم گوشوں کا احاطہ کرتا ہے۔ حتیٰ صاحب اردو کے ممتاز عالموں اور زبان دانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

© NCERT
not to be republished

ہماری کہاوتیں

یوں تو سارے جان دار اپنی بولیاں بولتے ہیں، لیکن با معنی لفظوں میں بات کرنا انسان ہی کا حصہ ہے۔ اسی لیے انسان کو حیوانِ ناطق کہا جاتا ہے۔ نطق کے معنی بولنا اور ناطق بولنے والا۔ انسان لفظوں اور جملوں سے بھی کام لیتا ہے۔ اشاروں کنایوں کا سہارا بھی لیتا ہے۔ اُن گلی، گردن یا سر کی جنبش، آنکھیں، تیور سبھی مطلب ادا کرنے میں کام آتے ہیں۔ آواز کا اتار چڑھاؤ بھی معنی رکھتا ہے۔ غرض بات کو ادا کرنے کے بہت سے ذہب ہیں۔ جسمانی حرکت، اشارے، اچھل کود وغیرہ تو حیوان بھی کرتے ہیں، لفظوں میں بات کرنا آدمی ہی سے مخصوص ہے۔ بات کو موثر طریقے سے ادا کرنے کا ایک طریقہ کہاوت یا مثل کا استعمال بھی ہے جسے ضرب المثل کہتے ہیں۔

ان مثالوں یا کہاوتوں میں بڑے گُر کی باتیں، زندگی کے تجربات کا نچوڑ اور ایک طرح کی شاعری بھی ملتی ہے یعنی نازک یا لطیف بات۔

مثل کی جمع امثلہ بھی آتی ہے۔ جیسے سلاح (تھنار) کی جمع اسلحہ۔ اب اردو امثلہ کی کچھ مثالیں پڑھیے:

آنکھوں پر پلکوں کا بوجھ: جب کوئی احسان یا بھلائی یا سلوک کا شکریہ ادا کرے یا شرمندگی محسوس کرے تو اس کا دل رکھنے کے لیے کہتے ہیں جیسے تم تو ہمارے اپنے ہو۔ ہمارے ساتھ رہے تو کیا ہوا۔ آنکھوں پر بھی کہیں پلکوں کا بوجھ ہوتا ہے، یا آنکھوں پر پلکوں کا کیا بوجھ۔

آپ کاج مہا کاج: اپنا کام اپنے آپ ہی کرنا چاہیے۔ دوسرے کا محتاج نہیں ہونا

چاہیے۔ نصیحت کے طور پر کہتے ہیں یا اپنا کام کرتے وقت دوسرے کو زحمت سے بچانے کے لیے۔ مہا کے معنی بڑا جیسے مہاراج، مہاپاپ۔

آگ پانی کا کیا میل : دو مختلف مزاج کے لوگ یا دو چیزیں جو ایک دوسرے کی ضد ہوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ یوں بھی کہتے ہیں کہ آگ اور پھونس کا کیا میل۔ ایک جگہ آگ کے پانی سے بجھ جانے کا ذکر ہے۔ دوسری جگہ پھونس کے آگ سے بھسم ہو جانے کا۔

تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی : جھگڑے کی تہہ میں دیکھیے تو اکثر دونوں فریقوں کا کچھ نہ کچھ قصور نکلے گا۔ اگر کسی کی وقتی زیادتی کا جواب زیادتی سے نہ دیا جائے تو جھگڑا نہیں ہو سکتا۔ بھینس کے آگے بین بجانا : ناقدریوں سے قدر دانی کی توقع کرنا۔ نہ کہ سچ بچھینس کے آگے باجالے کر بیٹھ جانا۔

پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں : ہر آدمی کی طبیعت، مذاق، مزاج، صلاحیت دوسرے سے قدرتی طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ اس کا لحاظ رکھنا چاہیے یا کسی ایک کی بُرائی یا کسی کو دیکھ کر پورے گروہ یا قوم کو ویسا ہی نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ یوں بھی کہتے ہیں کہ آدمی آدمی انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر۔ انتر کے معنی مختلف کے ہیں۔

ٹھنڈا لوہا گرم لوہے کو کاٹتا ہے : لوہے کو ڈھالنے کے لیے پہلے اسے تپا کر پگھلایا یا نرم کیا جاتا ہے۔ پھر ٹھنڈے اوزاروں کے ذریعے سے کاٹا یا ڈھالا جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ نرا جوشیلا پن نہیں بلکہ ٹھنڈے دل سے سوچی ہوئی تدبیر کام آتی ہے۔ بعض لوگ ناحق طیش میں آ کر نقصان اٹھا جاتے ہیں۔

کیا مرغانہ ہوگا تو سویرا بھی نہ ہوگا : کسی بات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ مرغاصح کو اذان دیتا ہے تو اس کو صبح کے ہونے کا سبب نہیں کہہ سکتے۔

چنے چا بویا نفیری بجالو : ایک وقت میں ایک کام ہی اچھی طرح انجام دیا جاسکتا ہے۔

سوتا سوتے کو نہیں جگا سکتا: جو خود غافل یا بھٹکا ہوا ہو وہ دوسرے کو نہیں سدھا سکتا۔
شیر کی پیٹھ پر کاٹھی کسنا: سرکش آدمی کو رام کرنے کی کوشش کرنا جس کا قابو میں آنا محال ہو۔
لکھتم کے آگے بکتم کیا چیز ہے: زبانی بات یا دعویٰ لکھی ہوئی بات کے سامنے
اہمیت نہیں رکھتا۔ قرآن شریف میں بھی یہ ہدایات کی گئی ہیں کہ آپس میں کوئی معاہدہ کرو تو
اسے لکھ لو اور جو لکھنا نہ جانتے ہوں وہ کسی سے لکھوالیں اور گواہ بنالیں تاکہ اختلاف یا
جھگڑے کا امکان نہ رہے۔

سفیدی پر سیاہی چڑھنا: بات پکی ہو جانا۔ کسی بات کا تحریر میں آ جانا۔ بہادر شاہ ظفر کا
شعر ہے:

کھلے گاہ خط کے لکھنے سے مرا حال اور بھیدی پر
سیاہی چڑھ گئی اے نامہ بر اب تو سفیدی پر

جب زبان زندگی میں ہر طرف سب کاموں کے لیے استعمال ہو تو خوب پھلتی پھولتی
ہے۔ اپنی قوم کی ذہنی صلاحیتوں اور تجربات سے پورا فائدہ اٹھاتی اور ان کی عکاسی کرتی ہے،
ورنہ ٹھہر کر رہ جاتی ہے۔ ہماری زبان کے الفاظ کا سرمایہ، محاورات اور کہاوتیں اس زمانے کی
یادگار ہیں جب کہ یہ آزاد تھی۔ اس کے پر بندھے ہوئے نہیں تھے، جیسے کہ اب ہم نے اپنے
اوپر انگریزی زبان کو مسلط کر لیا ہے۔ انگریزی بڑی اہم زبان ہے۔ ضرور اچھی طرح سیکھنی
چاہیے، لیکن یہ ہماری زبان نہیں بن سکتی۔ دیکھیے سر سید احمد خاں نے جو ہماری قوم میں جدید
تعلیمی تحریک کے بانی تھے، اب سے سو برس پہلے کیا سچی بات کہی تھی:

”انگریزی قوم نے جو اس قدر ترقی کی ہے وہ صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ تمام
علوم و فنون اسی زبان میں ہیں جو وہ لوگ بولتے ہیں۔ اگر انگریزی زبان میں تمام علوم و فنون
نہ ہوتے بلکہ لیٹن یا گریک میں یا فارسی عربی میں ہوتے تو تمام انگریز ایسے ہی جاہل اور بے علم

اور ناخواندہ ہوتے جیسے کہ بد نصیبی سے ہم لوگ ہندوستانی ہیں اور آئندہ کو بھی جب تک کہ تمام علوم و فنون ہماری زبان میں نہ ہوں گے ہم جاہل اور نالائق ہی رہیں گے اور کبھی عام تربیت نہ ہوگی۔“ (تہذیب الاخلاق)

مشق

لفظ و معنی

ناطق	:	بولنے والا
کنایہ (کنایوں)	:	پوشیدہ بات، جب ہم کسی بات کو کھل کر نہیں کہنا چاہتے تو اصل لفظ کی جگہ اس کے لیے کنایوں کا استعمال کرتے ہیں۔
جنبش	:	حرکت
دھب	:	طریقہ
لطیف	:	نرم، پاکیزہ
طیش	:	غصہ
سرکش	:	مغرور، نافرمان
معاہدہ	:	سمجھوتہ
نامہ بر	:	خط پہنچانے والا، ڈاک
مسلط	:	حاوی، چھایا ہوا
رام کرنا	:	فرماں بردار بنانا
ناخواندہ	:	اُن پڑھ

غور کرنے کی بات

- بولنے کے لیے ہم لفظوں اور جملوں سے تو کام لیتے ہی ہیں۔ اس کے علاوہ اشاروں اور کنایوں کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ جسم کے مختلف حصوں کی جنبش اور تیز بھی مطلب ادا کرنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ بات میں اثر پیدا کرنے کے لیے کہاوتیں اور مثالیں بھی ہمارا بہت ساتھ دیتی ہیں۔
- زبان کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی زبان میں اتنی طاقت پیدا کریں کہ زیادہ تر علوم و فنون تک دوسری زبانوں کے ذریعے پہنچنے کے بجائے اپنی زبان کے ذریعے پہنچیں۔

سوالات

1. کہاوت یا مثل کسے کہتے ہیں؟
2. ”آپ کاج مہاکاج“ اس کہاوت کا مطلب اپنے لفظوں میں لکھیے۔
3. زبان کس طرح پھلتی پھولتی اور پھیلتی ہے؟
4. کہاوتیں اور محاورات کس زمانے کی یادگار ہیں؟
5. ”پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں“ اس کہاوت کا مطلب لکھیے۔

عملی کام

- ”بھینس کے آگے بین بجانا“ اس کہاوت کے مطابق اپنی زندگی کا کوئی واقعہ لکھیے۔